SHNAKHAT E(ISSN) 2709-7641, P(ISSN) 2709-7633
Vol:3, ISSUE:3 (2024) PAGE NO: 420-440
Publishers: Nobel Institute for New Generation
http://shnakhat.com/index.php/shnakhat/index

Cite us here: Dr. Muhammad Khurram Yasin, Dr. Muhammad Awais Saleemi, & Dr. Ghulam Mustafa Farooq. (2024). The Short Story Collection 'Aas Paas' in the Mirror of Feminist Issues. *GUMAN*, *7*(3). Retrieved from https://guman.com.pk/index.php/GUMAN/article/view/852

"Existential Anguish in Ghalib's Poetry: An Existentialist Perspective" (A Study of the First Fifty Ghazals)

"کلام غالب میں کرب وجود۔ فلسفہ وجودیت کے آئینے میں"
پہلی پچاس غزلوں کے حوالے سے

Dr. Muhammad Khurram Yasin[1] Dr. Muhammad Awais Saleemi[2] Dr. Ghulam Mustafa Farooq3

[1]Lecturer, Govt. College Women Univesity, Sialkot (Corresp.Author)
khuram.yasin@gcwus.edu.pk
[2]Assist. Controller of Examination, Govt. College Univeristy, Fsd. mawaissaleemi@gmail.com
[3]Assistant Education Officer, Faisalabad. ghulammustafa7600@gmail.com

Abstract
The research article explores existentialist themes in Ghalib's poetry, particularly focusing on the first fifty ghazals. The study delves into how Ghalib's life experiences—personal losses, societal challenges, and philosophical musings—manifest in his poetry as existential anguish, a central concern of existentialism. Existentialism emphasizes individual freedom, choice, and responsibility in an inherently meaningless world, and Ghalib's verses resonate with these themes. The article draws parallels between European existentialist thinkers like Kierkegaard, Sartre, and Camus, and Ghalib's exploration of human existence, freedom, and the inevitability of death. The analysis highlights how Ghalib uses metaphors, such as the transitory nature of human life, isolation, and the search for meaning, to express existential angst. His reflections on the impermanence of life, the futility of desires, and the inevitability of death reflect a deep engagement with the philosophical problems of existence. Ghalib's poetry, particularly his ghazals, is analyzed to show how he poetically grapples with the themes of freedom, despair, and meaning-making in life, despite the overwhelming presence of suffering. By doing so, Ghalib's work transcends personal grief, becoming a universal commentary on human existence. The article thus frames Ghalib not just as a poet of his era but as a timeless figure engaged with existentialist concerns.

Key Words: Existentialism، Ghalib's Poetry, Existential Anguish, Freedom and Choice, Meaning of Life, Mirza Ghalib

کلیدی الفاظ: وجودیت، دیوانِ غالب، وجودی کرب، آزادی واختیار، مرزا غالب، غلام رسول مہر

وجودیت، یورپی فلسفے کا ایک نمایاں نظریہ ہے، جو انسانی وجود کی انفرادیت، آزادی اور انتخاب کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ یہ نظریہ زندگی کی عدم یقینی اور انسانی ذمہ داری کو بھی اجاگر کرتا ہے، جس کے مطابق ہر انسان اپنی زندگی کے معانی خود تخلیق کرتا ہے اور اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس فلسفے کے بنیادی خدوخال سورین کیئرکیگارڈ(Kierkegaard)کے کام میں نظر آتے ہیں، جنھوں نے اپنی کتب (Trembling 1843 Sickness Unto, (اور) The Concept of Dread 1844)۔(Fear and Death 1848)میں اس نظریے کے ابتدائی نقوش پیش کیے۔ ان کا یہ نظریہ مذہبی رجحان رکھتا تھا اور انسان کو خدا کے ساتھ منسلک کرتا تھا جس کی وجہ سے اسے تاریخ میں "مسیحی وجودیت" کا نام بھی دیا گیا۔ فلسفہ وجودیت کی مذہبی بنیاد کی بات کی جائے تو یہ امر واضح ہے کہ ابتدا میں انسانی وجود کا خدا کی ذات پر انحصار اس کی زندگی کی تسکین، برتری اور مقصدیت کے لیے نہایت اہم سمجھا گیا۔ تمام بڑے مذاہب میں اس تصور کو قبول عام حاصل ہے کہ ایک برتر ذات کا یقین انسان کے دل ودماغ کو روحانی سکون، مشکلات میں صبر و حوصلہ اور ہمت بخشتا ہے۔ اس سے اس کی نہ صرف روحانی بلکہ مادی زندگی پر بھی مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ربط ایک ایسی روشنی کی مانند ہے جو تاریک ترین راہوں میں نور مہیا کرتا ہے اور انسان کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ اس کا وجود بے مقصد نہیں، بلکہ عقلِ کل کی اعلیٰ حکمت اور منصوبے کا حصہ ہے۔ اسے اس مقام پر بھی رہنمائی ملتی ہے جہاں اس کی محدود عقل جواب دینے سے قاصر ہوجاتی ہے۔ یوں، خدا کی ذات اور موجودگی کا یقین انسانی وجود کو ایک نئی معنویت اور زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔

اپنی ابتدا کی نسبت یہ فلسفہ وجودیت بیسویں صدی کے وسط میں سائمن ڈی بوویر (Simon de Beauvoir) کی (Translated, The Second Sex 1949)اور-(Translated- The Ethics of Ambiguity 1947)ایسی تحاریر کے ذریعے ارتقا پذیر ہوا۔ جب کہ ژاں پال سارتر (Jean-Paul Sartre)اور البرٹ کامیو (Albert Camus) نے اس فلسفے کو الحادی روپ دیا اور یورپ کے موثر ترین نظریات میں سے ایک بنا دیا۔ سارتر کے مطابق خدا کے بغیر بھی انسان اپنی زندگی کے معنی خود تخلیق کر سکتا ہے اور اگرچہ انسان بظاہر آزاد ہے، لیکن ہر جگہ مختلف معاشرتی، اخلاقی اور ذاتی قیود میں جکڑا ہوا ہے۔ اس صورتِ حال میں اگر وہ اپنی زندگی کا خود

معنی گر نہیں ہے تو اس کی زندگی گویا بے کار ہے۔ اس کے مطابق انسان آزاد ہے تو یہ آزادی اپنی زندگی کے ہر انتخاب میں ذمہ داری کا بوجھ بھی ساتھ لاتی ہے۔ سارتر نے اس فلسفے کو انسان دوستی کا نام بھی دینا چاہا۔ اس نے باقاعدہ اس نظریے کی ترویج و اشاعت پر کام کیا اور اس ضمن میں جو تحاریر لکھیں ان میں (1943 Being and Nothingness)اور (1946 Existentialism is a Humanism) سرِ فہرست ہیں۔ البرٹ کامیو، جنھیں وجودیت میں بے معنویت یا مضحکہ خیزی (Absurdism) کے نظریے کا بانی سمجھا جاتا ہے، اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دنیا میں کوئی بھی حقیقت پہلے سے طے شدہ نہیں اور نہ ہی اس کا طے شدہ معنی یا مقصد ہوتا۔ ان کے مشہور ناول The Stranger اور مضمون The Myth of Sisyphus اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ انسان کو زندگی کی بے معنویت کا سامنا کرتے ہوئے بھی اپنے اعمال کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ فلسفہ وجودیت نے ادب اور فلسفہ دونوں پر گہرا اثر ڈالا، اور انسانی وجود، آزادی اور انتخاب کے گرد گھومنے والے مباحث نے جنم لیا۔ وجودیت جس کا مادہ وجود سے ہے، کے بارے میں مولوی سید احمد دہلوی لکھتے ہیں:

"وجود کے لغوی معانی حصولِ مقصد یا مطلوب کا پانا، مجازاً بدن، جسم، نقیض، عدم ہستی، ذات، زندگی، وجود گی، بود، تکوین، تدوین، پیدائش، حیات، تنفس، ظہور، نمائش وغیرہ۔" (۱)

اگرچہ یہ تعریف فلسفیانہ وجودیت سے براہِ راست مطابقت نہیں رکھتی، لیکن اس میں موجود "حصولِ مقصد" کی طرف اشارہ موجودیت کی فلسفیانہ تعریف کے قریب ہے۔ فلسفہ وجودیت کے مطابق، انسان اپنے اعمال اور تجربات سے اپنی زندگی کا مقصد اور معنی خود تراشتا ہے۔ پروفیسر انور جمال اس فلسفے کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وجودیت اگرچہ جدید فلسفے کی اہم شاخ اور ایک اعتبار سے ہیگل کی "منظم عقلیت" کا رد عمل بھی ہے لیکن اس نے جدید شعر و ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ تحریک فرد کی غیر مشروط آزادی پر زور دیتی ہے اور حقیقت یا ہستی کے تصور کو فرد کے انتہائی موضوعی تجربے کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔۔۔ بالعموم وجودی ادب میں عواطف کی بوقلمونی، شدتِ جذبات اور تخیل کی رنگینی کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔(2)

آکسفورڈ ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز میں اس نظریے کے آغاز و ارتقا کے بارے میں کچھ نئی معلومات ملتی ہے۔ مثلاً یہ کہ "وجود، ماہیت پر مقدم ہے" یعنی بطور انسان ہماری کوئی پہلے سے طے شدہ فطرت، مقصد یا جوہریت (essence) نہیں ہوتی۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انسان دنیا میں انسان مخصوص معنی یا مقصد لے کر پیدا نہیں ہوتا بلکہ، اپنے اعمال، تجربات اور انتخاب کے ذریعے اپنی زندگی کے معنی اور اقدار خود تخلیق کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

Existentialism, a current in European philosophy Distinguished by its emphasis on lived human existence.... Sartrean existentialism, as distinct from the Christian existentialism derived from Kierkegaard, is an atheist philosophy of human freedom conceived in terms of individual responsibility and authenticity. Its fundamental premise, that 'existence precedes essence', implies that we as human beings have no given essence or nature but must forge our own values and meanings in an inherently meaningless world of existence. Obliged to make our own choices, we can either confront the anguish of this responsibility, or evade it by claiming obedience to some 3determining convention or duty, thus acting in 'bad faith'. (

معاملاتِ زندگی پر غور کیا جائے تو یہ عام مشاہدے میں آتا ہے کہ آسمانی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو اپنے ساتھ ہونے کا یقین دلانے اور ناامیدی سے بچانے کے وعدوں کے باوجود، انسان اکثر احوال و مشکلاتِ زندگی سے تنگ آکر چلاّ اٹھتا ہے، قدیم روایات و اقدار پر سوالات اٹھاتا ہے اور اطمینانِ قلب سے محروم ہو جاتا ہے۔ دنیا میں جہاں صلیبی جنگوں اور جنگِ عظیم اول و دوم کے اثرات کے نتیجے میں عوام میں زندگی کی نئی معنویت کی تلاش کی فکر جاگی، جس میں مذہب اور مسلّمہ روایات سے انحراف شامل تھا، وہیں انقلابِ فرانس اور صنعتی انقلاب کے بعد چرچ کی سیاسی اور معاشرتی طاقت کے خلاف ایک ردعمل بھی آیا۔ زمین کے ٹکڑوں کی خاطر لاکھوں لوگ لقمہ اجل بنے اور دین کے نام پر بھی ایسی ہی قربانیاں پیش کی گئیں۔ ایسے میں جب کہ دنیا بڑے بڑے انقلابات سے گزر چکی تھی، علمی اور صنعتی ترقی عروج پذیر تھی، یورپ میں روایتی توہم پرستی اور مسلمّات کے خلاف ردِ عمل آنا بالکل فطری تھا۔ اسی وجہ سے وجودیت کا نظریہ تیزی سے پھیلا اور پھلا پھولا۔ اس نے فرد کو ہر قسم کی روایتی اخلاقی اور مذہبی حدود و قیود سے آزاد ہونے کی بنیاد مہیا کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مغرب میں لوگ مادر پدر آزادی کی جانب مائل ہو گئے۔ اس کے

اثرات مغرب سے مشرق میں بھی آئے جنھیں پاکستان ایسے اسلامی ملک میں "میرا جسم میری مرضی" ایسے نعروں اور ڈراموں کے ضمن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو وجودیت کے تین پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں جن میں اہم ترین مادر پدر آزادی کی وجودیت ہے جب کہ دیگر میں انسان کے وجود کا اللہ کریم کی ذات پر انحصار اور تیسرا اس کا اپنے ماحول اور حالات کے خلاف اپنے وجود کو خطرے میں محسوس کرنا اور اس پر ردعمل دینا شامل ہے۔ اردو کے شعرا کا زیادہ تر تعلق اسی تیسری وجودیت سے رہا ہے۔ علامہ اقبال کا "شکوہ" بنیادی طور پر وجودی فکر رکھتا ہے جس میں وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر انحصار کرتے ہوئے اپنی قوم کے اجتماعی کرب کا اظہار کرتے ہیں، سوال اٹھاتے ہیں اور غیر مختتم مسائل کا حل جاننا چاہتے ہیں۔ اقبال کا مقصد چوں کہ اس شکوے کے جواب میں قوم کی تعمیر اور فکری تطہیر تھی اس لیے وہ قومی حمیت و غیرت کو جگانے کی کوشش کرتے ہیں اور حدود قیود کے اندر رہتے ہوئے فرد کی "خودی" کو پروان چڑھانے کی تعلیم دیتے ہیں۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869) کی شاعری میں فلسفیانہ گہرائی، انسان کے وجودی مسائل، اور داخلی پیچیدگیوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ان کی زندگی کا مطالعہ آشکار کرتا ہے کہ ان کی شاعری میں وجودیت کا رنگ ان کی ذاتی زندگی کے نشیب و فراز، دکھوں اور محرومیوں کا نتیجہ تھا۔ نوعمری میں والدین کی دنیا سے رخصت، اولاد کا زندہ نہ رہ پانا، بیگم کے لے پالک جواں سال بھانجے عارف علی خان کی جوانی میں وفات، بھائی کی جنونی حالت اور بعد ازاں اس کی وفات کی صورت میں خاندان کا معاشی بوجھ، زندگی میں بڑے عرصے تک شاعری کو قبولِ عام نہ مل پانا، وظائف بند ہونا، پنشن کا مقدمہ، قید و بند کی صعوبتیں، دہلی کے سیاسی اور سماجی حالات، فکرِ معاش اور بہت سے انفرادی دکھوں نے غالب کو ایک گہرے فکری سفر پر مجبور کیا جس کا عکس ان کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ ان سب مسائل کے نتیجے میں ان کا زندگی کی حقیقت پر شک، فلسفہ غم اور اس کا موثر اظہار ان کے وجودی کرب (Existential Anguish) کی نمائندگی کرتا ہے جو انفرادی سطح سے بلند ہو کر اجتماعیت کو اپنے دامن میں سمو لیتا ہے۔ مثلاً عارف علی خان کی وفات پر وہ جس قدر رنجیدہ تھے اس کے مرثیے کی آواز ان کی اس غزل میں سنائی دیتی ہے "لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور"۔ یہاں ان کا غم انفرادی نہیں رہتا بلکہ اسے سننے اور پڑھنے والا ہر وہ شخص جس کا کوئی اپنا قریبی دنیا سے

رخصت ہوا ہو، وہ غالب کے غم میں شامل ہوجاتا ہے۔اسی طرح "بازیچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے "اور "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے" ایسے اشعار آفاقی سچائیاں اور انسانی کرب سمیٹے ہوئے ہیں۔

آفاقی حوالے سے دیکھیں تو غالب کا فکری کرب انسانی وجود کی ناپائیداری، زندگی کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی مشکلات اور معاملات عشق میں کسی حد تک ناکامی ساتھ جڑا ہوا ہے۔ ذیل میں غالب کے وجودی کرب کے حوالے سے بال خصوص پہلی پچاس غزلوں کا مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔ دیوان کی پہلی ہی غزل میں غالب زندگی کی بے ثباتی، تکالیف اور جہدِ مسلسل کے ایسے اشارات ملتے ہیں جو دنیا میں انسانی کی موجودگی، غیر مختتم مسائل اور مقصد پر سوال اٹھاتے ہیں۔ پہلے شعر میں وہ انسانی وجود کو ایک عارضی اور ناپائیدار شے کے طور پر پیش کرتے ہیں، جو محض کاغذی لباس میں ملفوف ہے۔ ان کا وجودی کرب ، دراصل ہر زندہ انسان کا المیہ ہے۔ پیکرِ انسانی کا فلسفہ فنا وجودیت کا مرکزی تصور ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا(4)

اس شعر میں بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے اور اپنا مدعا پیش کرنے کے لیے کاغذی لباس اور اس پر عارضی تحریر کی تلمیح موجود ہے جس کی جانب سبھی شارحینِ غالب نے اشارہ کیا ہے؛ لیکن "کاغذی پیرہن" کے محض ایک معنی پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ غالب "ہر پیکرِ تصویر" یعنی ہر انسان ہی کے وجود کو کاغذی یعنی عارضی، بہت نازک اور ناپائیدار سمجھتے ہیں جو انسانی زندگی کی بے ثباتی اور بے وقعتی کی علامت ہے۔ اسپتالوں میں جائیں، ٹریفک حادثات ، زلزلے اور طوفانوں میں برباد ہونے والے لاکھوں انسانوں کی زندگیوں پر غور کریں تو اس بات پر ایمان پختہ ہوتا ہے کہ یہ زندگی حد درجہ عارضی اور بے وقعتی کا شکار ہے۔ اس شعر کی تشریح میں مولانا حسرت موہانی غالب ہی کی زبانی (عودِ ہندی) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

مطلب یہ کہ ہستی چونکہ موجب ملال و آزار ہے اس لیے تصویر بھی اپنے صانع کی بزبان حال شکایت کرتی ہے کہ مجھ کو ہست کرکے کیوں مبتلائے رنج ہستی کیا(ماخوذ از عودِ ہندی)۔ مقصود شاعر یہ ہے کہ ہستی بہر حال (یعنی اگرچہ مثل ہستی تصاویر اعتبار محض ہو) موجب آزار ہے۔(5)

جب کہ مولانا غلام رسول مہر اس شعر کی تشریح میں لکھتے ہیں:

ہستی کو تصویر اس لیے کہا کہ اس کا وجود حقیقی نہیں، غیر حقیقی اور اعتباری ہے، مگر اعتباری اور عارضی ہونے کے باوجود وہ اتنے رنج وملال کا باعث ہوئی کہ ہر ہستی سراپا فریاد بن گئی۔"(6)

دونوں تشریحات انسانی وجود کی معنویت پر سوال اٹھاتی ہیں۔ غزل کا دوسرا شعر ملاحظہ کیجیے جس میں غالب انسانی وجود کی جدوجہد اور تنہائی کی کرب ناک صورتِ حال کا ذکر کرتے ہیں۔ "سخت جانی" اور "تنہائی" دونوں وجودیت کی خاص علامات ہیں۔ کیا ان کا تعلق محض غالب کی محبوبہ کے بچھڑنے اور اسے یاد کرنے سے مخصوص کیا جا سکتا ہے؟ یقینا نہیں۔ نو آبادیاتی، آمریت اور نیم آمریت کے ادوار میں فرد کی اپنی ہستی ایک طرح سے فنا ہو جاتی ہے۔ اسے دو وقت کی روزی روٹی کے لیے صبح تا شام جن مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے، ان پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شعر محض ایک فکری حوالہ نہیں رکھتا، اس میں ساری انسانیت کا دکھ ہے۔ دوسرے معانی پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ بے بسی اور فاقہ مستی کے دنوں میں جب انسان تنہا رہ جاتا ہے تو اس کے لیے وقت کاٹنا مشکل عمل ٹھہرتا ہے، جو ایک طرح سے زندگی کی بے رحمی کی علامت ہے۔ غالب اس شعر میں انسانی وجود کی جدوجہد اور وجود کی تنہائی کو ایک گہری اور دردناک حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ تنہائی کا مطلب محض یہی نہیں ہے کہ انسان دیگر انسانوں سے دور ہو بلکہ یہ تنہائی کسی مونس وغم خوار کی دوری کے سبب سے پیدا ہوتی ہے یا پھر ایسے اسباب سے جن کا غالب شکار رہے یعنی دلی دربار کا اجڑنا اور اپنے ہی گھر اور محلے میں قید ہو جانا وغیرہ۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا(7)

دوسرا مصرع زندگی کے مسلسل اور کٹھن سفر کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا سفر ہے جس میں انسان کو اپنی زندگی کے ہر مرحلے پر نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں "جوئے شیر "لانا زندگی پر عدم تیقن اور خطرات سے بھی عبارت ہے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضروریات اور خوشیوں کے لیے ہر دن بڑا خراج دینا پڑتا ہے۔ کربِ وجود کے ضمن میں ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے جو بظاہر تو وجودی فکر نہیں رکھتا لیکن اس پر جتنا غور کرتے جاتے ہیں، اس کی نئی پرتیں کھلتی جاتی ہیں۔ اس سے انسانی وجود کے مسائل، تنہائی، اور اندرونی کرب کا اظہار ہوتا ہے:

میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافل! بارہا میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا(8)

غالب نے اس شعر میں اپنے وجود کی ایک ایسی کیفیت بیان کی ہے جو بے یقینی سے عبارت ہے اور انسان کو مسلسل اضطراب میں مبتلا رکھتی ہے۔ یہاں "عدم سے پرے" ہونا صرف ایک جغرافیائی یا جسمانی حالت نہیں بلکہ ایک وجودی حالت ہے، جہاں انسان خود کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جس سے وہ لاتعلقی محسوس کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا ہے جو اسے اجنبی لگتی ہے۔ "آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا" بظاہر مبالغے پر مشتمل لگتا ہے لیکن یہ انسانی کرب کی بہترین ترجمانی ہے۔ غالب نے اپنے دیگر اشعار میں بھی اس بات کا ذکر کیا ہے کہ جتنا درد اور غم وہ برداشت کر رہے ہیں اور اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں، وہ ظاہر ہو جائے تو دنیا ایک تباہی سے دوچار ہو۔ موجودہ صورت میں فلسطین کا احوال ملاحظہ کیجیے اور سوچیے کہ وہاں مسلمان جو کچھ سہہ رہے ہیں، ان کے سینوں میں کتنا غم وغصہ ہوگا ؟مال اسباب سے اپنے پیاروں کو کھونے تک کے حالات انھیں زندگی بھر سکون سے بیٹھنے دیں گے ؟کیا انھیں پل پل مرنا نہیں پڑے گا؟اس ضمن میں کہا جا سکتا ہے کہ شعر انسانی وجود کی اذیتوں کے اس انسانی سفر کی جانب اشارہ کرتا ہے جو درد، غم اور تنہائی سے اٹا ہوا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر اس شعر کی تشریح میں لکھتے ہیں:

میں عدم سے بھی آگے نکل گیا، یعنی اس درجہ معدوم ہو گیا کہ عدم بھی میرے مقام کے تعلق میں وجود کی حیثیت رکھتا ہے ورنہ جب تک عدم یعنی عالمِ فنا میں تھا تو بارہا ایسا ہوا کہ میرے دل میں آگ برسانے والی جو آہ اٹھتی تھی، اس سے عنقا کے پر جل جاتے تھے۔(9)

مولانا حسرت موہانی نے اور آسی الدنی نے بھی اس شعر کی تشریح اسی انداز میں کی ہے۔ نظم طباطبائی نے اس شعر کو بے معنی قرار دیا ہے جس کی وجہ ایک ہی وقت میں عدم اور اس سے دور ہونا شامل ہے البتہ پروفیسر سلیم یوسف چشتی نے اس شعر کی تشریح میں بہت سے نئے نکات پیش کیے ہیں اور مثالوں کے ساتھ اس کے معانی تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

اس شعر میں غالب نے اپنی پرواز تخیل کا کمال دکھایا ہے کہ عدم کو وجود اور معدوم کو موجود میں تبدیل کر دیا۔ عنقا چوں کہ معدوم ہے اس لیے قدرتی طور پر اس کا مسکن عدم میں ہے یعنی وہ عدم میں موجود ہے اور چوں کہ موجود ہے اس لیے غالب نے ملک عدم میں پہنچ کر اس کے پر جلا دیے اور

اس بیچارے کو نذر آتش کرکے روانہ ہوگئے۔ بنیادی تصور:اپنی نیستی یا فنائیت کے بیان میں مبالغہ فرمایاہے۔(10)

اس شعر کی تشریح میں شارحین ایک دوسرے سے اختلاف کیاہے لیکن اس بات پر بہرحال سب متفق ہیں کہ انسانی وجود، محض ایک گوشت کالوتھڑا نہیں ہے بلکہ اس میں سوچنے سمجھنے والا دماغ اور جذبات سے معمور دل رکھ دیا گیا ہے۔ یہ بہت سی جسمانی اور فکری پیچیدگیوں کے ساتھ آخری سانس تک اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یعنی انسان کو کبھی بھی درد وغم سے فراغ نہیں، جو خوشی کے لمحے مل جائیں وہ غنیمت ہیں۔ اسی ضمن میں غالب ایک اور شعر تحریر کرتے ہیں:

شوق، ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا(11)

اس شعر میں قیس کی جانب اشارہ ہے کہ وہ زندگی میں سکون نہ پاسکا اور جس بے سروسامانی کی حالت میں دنیا سے گیا، بعد از وفات بھی اسے اس کے حال ہی سے یاد کیا جاتا رہا۔ یعنی اس کی زبوں حالی ہی اس کی پہچان بن گئی۔ اگر ہم اس شعر میں قیس کی جگہ ایک غریب اور مفلس انسان کو رکھ کر دیکھیں تو انسان دوستی کے ہزاروں اشعار اور پچاسیوں افسانے ذہن میں آئیں گے جیسے "کفن"، "اوور کوٹ"، "آنندی"، "موچی"وغیرہ۔ اس کے علاوہ "غریب کی جورو سب کی بھابی"، "غریب کا کوئی ایمان نہیں ہوتا" ایسی ضرب الامثال اور محاورات بھی زیرِ غور آئیں گے۔ ان سب پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم زندگی کے حقائق سے بھاگ نہیں سکتے۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلینے سے کچھ بھی تبدیل نہیں ہوپاتا۔ وجود کی سلامتی کے لیے، ہر دن لڑنا پڑتا ہے ورنہ جو حال قیس کا ہوا کہ بعد از وفات بھی اس کی تصویر کی عریانی نہیں گئی، اسی طرح نسل در نسل غلام در غلام اور غریب در غریب ہی پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ ایک اور زاویے سے دیکھا جائے تو تمام تر پوشیدگیوں اور لبادوں کے پیچھے بھی عریانی، انسان کی داخلی شناخت اور وجودی حالت کی عریانی کا استعارہ ہے۔ یہ شعر وجودی فلسفے کے مرکزی خیالات کی ایک گہری اور معنی خیز عکاسی کرتا ہے۔ اس شعر کی تشریح میں یوسف سلیم چشتی، مولانا غلام رسول مہر، مولانا حسرت موہانی اور آسی الدنی، وغیرہ سبھی نے محض ظاہری معانی ہی پر اکتفا کیا ہے۔

دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالبؔ آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا(12)

یہ شعر انسانی کرب اور نفسیاتی سطح پر اس کا تذکیہ نفس نہ ہونے کی صورت میں غیر خارج شدہ جذبات کی شدت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ وجودیت کے اس پہلو کو نمایاں کرتا ہے کہ انسان کا داخلی کرب جب شدت اختیار کرلیتا ہے تو وہ ایک طوفان کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ یہ انسان کی اس جدوجہد کو ظاہر کرتا ہے جو وہ اپنے احساسات اور جذبات کو دبانے میں کرتا ہے اور نتیجتاً ذہنی خلفشار، تناؤ اور روحانی کرب کا شکار ہوجاتا ہے جو اسے اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے یا پھر جب ہم اپنے جذبات کو دباتے ہیں تو وہ ایک دن ایسے پھوٹ پڑتے ہیں کہ ہم ان پر قابو نہیں پاسکتے۔ آسی الدنی نے اس کی تشریح یوں کی ہے:

رونے میں جو میں نے کچھ ضبط سے کام لیا تھا اور کوئی قطرہ میری آنکھ میں رہ گیا تھا اس قطرے نے دل میں پھر اک شور اٹھا رکھا ہے۔ گویا نہ نکلنے والا قطرہ طوفان تھا۔(13)

کربِ وجود ہی کی ذیل میں ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا اڑنے سے پیشتر بھی، مرا رنگ زرد تھا(14)

اس شعر میں مرگ کی جگہ موت کا لفظ بھی استعمال کیا جاسکتا تھا جس سے صنعتِ تضاد میں بہتری ممکن تھی، لیکن غالب نے "مرگ" کا لفظ استعمال کیا جو محض موت نہیں بلکہ پل پل مرنے کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ شعر کی تشریح میں پروفیسر سلیم یوسف چشتی لکھتے ہیں کہ پہلا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ موت سے ڈرتے ہیں ان پر ہمہ وقت مردنی چھائی رہتی ہے، ان کا رنگ مرنے سے پہلے بھی زرد ہوتا ہے۔ دوسرا بلیغ مطلب "موتو قبل ان تموتو"(مرنے سے پہلے مرجاؤ) کے صوفیانہ مفہوم کو نظم کیا ہے۔(15)

وجودی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ شعر انسان کی موت کے ساتھ مسلسل وابستگی اور خوف کو ظاہر کرتا ہے۔ انسان ہر وقت موت کے امکان سے خوفزدہ رہتا ہے، اور یہ خوف اس کے وجود کو پریشان کرتا رہتا ہے۔ ہم بہترین اور اعلیٰ ترین ہونے کے باوجود ایک دن مرجاتے ہیں اور کچھ ہی دن کے بعد لوگ ہماری غیر موجودگی کو محسوس کرنا بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ غالب اس شعر میں انسان کے وجود کی ایک ایسی کیفیت بیان کرتے ہیں جہاں انسان موت کے سایے میں زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ خوف انسان کو مسلسل پریشان کرتا رہتا ہے اور اس کی زندگی کو بے چین بنا دیتا ہے۔ موت سے چھٹکارا کسی بھی ذی

حیات کے لیے ناممکن ہے، لیکن انسانی حالات بعض اوقات اسے اس قدر بزدل بنا دیتے ہیں کہ وہ جینے سے بھی خوف زدہ رہتا ہے۔ معاشرتی جبر کی کئی مثالیں خود غالب کی زندگی سے دیکھی جا سکتی ہیں جس میں پنشن کا مقدمہ اور وظائف کا بند ہونا شامل ہے۔ اولاد کی وفات کے بعد حصولِ اولاد کی پھر سے کوشش میں موت زندگی کی کشمکش کا خوف بھی اس ضمن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسے میں انسان زندگی میں جینے سے بھی انسان اتنا ہی خوف زدہ رہتا ہے جتنا کہ مرنے کے خوف سے۔ مولانا غلام مہر رسول تشریح میں لکھتے ہیں:

مجھ پر زندگی بھر موت کا خوف طاری رہا اور خوف کے باعث انسان کا رنگ اصل حالت پر نہیں رہتا، اس میں زردی آجاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مرنے کے ساتھ چہرے پر جو زردی اور مردنی چھا جاتی ہے، اس سے پہلے بھی میرا رنگ زرد ہی تھا جو موت کے خوف سے پیدا ہوا تھا۔ خوف یہ کہ زندگی جیسی گزارنی چاہیے تھی، نہ گزری۔ خدا جانے مرنے کے بعد کیا حالت پیش آئے اور کیسی گزرے۔(16)

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی! دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا(17)

یہ شعر انسانی جذبات کی کشمکش اور درد کی نوعیت کو بیان کرتا ہے، جو وجودی کرب کی ایک اور مثال ہے۔ عشق میں ناکامی کا تو مذکور کیا، کامیابی بھی کچھ عرصے کے بعد بے معنی ہو جاتی ہے۔ انسان میں جستجو اور بہتر سے بہترین کی تلاش اور اس کا نامل پانا اسے داخلی کسک میں مبتلا کرتا اور بے چین رکھتا ہے ۔ پروفیسر سلیم یوسف چشتی اس شعر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان کے لیے اندوہ عشق سے رہائی ناممکن ہے۔ اگر دل سینے میں موجود ہے تو اس کا ہونا بے چینی کا موجب ہے اور اگر اسے سینے سے نکال دیا جائے تو اس کا جانا بجائے خود موجب رنج و الم ہے۔(18)یوں یہ شعر وجودی فلسفے کے مرکزی خیالات کی ایک گہری اور معنی خیز عکاسی کرتا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ یہ درد انسان کے دل میں اتنا گہرا اتر جاتا ہے کہ وجود ہی کا حصہ بن جاتا ہے۔ یعنی غموں سے ایک طرح سے فرار ممکن نہیں۔ گو کہ اس کی تفہیم قنوطیت کی حامل ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ خوشی کی نوعیت عارضی اور غم مختلف شکلوں کے ساتھ مستقلاً زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مثبت حوالے سے دیکھیں تو یہ شعر

اس میں یہ کنایہ بھی موجود ہے کہ انسان کو اپنے آزار کو قبول کرنا چاہیے، کیوں کہ اسی صورت میں ہم اس پر قابو پا سکتے ہیں۔

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجیے ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا(19)

اس شعر کی تشریح میں مولانا غلام رسول مہر نے بحوالہ مرزا غالب لکھا ہے کہ میں خوش نصیبی سے اس درجہ محروم ہوں کہ اس دنیا میں جس خواہش کے لیے شاید ہی کوئی تیار ہو، یعنی مر جانا، میں اس کے لیے بھی تیار تھا، لیکن یہ خواہش بھی پوری نہ ہوئی، یعنی مرنا بھی میسر نہ آسکا۔ یہ محرومی اور ناکامی کی انتہا ہے، مگر شکایت کس سے کی جائے؟ فریاد لے کر کس کے پاس جائیں؟(20) یہ شعر بھی انسانی زندگی کی مشکلات اور اس میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی کشمکش کے ضمن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا غالب یہاں حد درجہ مغموم ہیں اور قنوطیت کو اوڑھنا بچھونا بنانا چاہتے ہیں؟ ہر گز نہیں۔ یہ زندگی کے وہ عمومی حقائق ہیں جن کا سامنا کرتے کرتے انسان تھکنے لگتا ہے اور وہ عارضی طور پر ان خطوط پر بھی سوچتا ہے۔ ایسے میں جب کہ اس کا مذہب کے ساتھ تعلق واجبی سا رہ جائے اور مشکلات کا ایک پہاڑ کھڑا ہو تب بھی وہ یہی سوچتا ہے کہ "مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا"۔ زندگی کی بے ثباتی کے حوالے سے غالب کا ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا، ہے خونِ گرم دہقاں کا(21)

جس طرح ایک بیج کے سینے میں درخت بننے کی طاقت رکھ دی جاتی ہے، اسی طرح انسان اپنے عارضی وجود کے ساتھ دنیا میں آتا ہے۔ اس کے حوالے سے قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے انسان کو بہترین حالت میں پیدا کیا پھر اسے گھاٹیوں کی طرف یعنی بوڑھاپے کی جانب لوٹا دیا۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ(22)

یہ شعر انسانی وجود کی ناپائیداری اور بربادی کے امکانات کی نشاندہی کرتا ہے۔ وجودیت میں یہ مانا جاتا ہے کہ انسان کی زندگی اور وجود میں ہر لمحے فنا یا خرابی کا عنصر شامل ہے، اور یہی اسے حقیقت کے قریب لاتا ہے۔ یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں:

"غالب نے اس شعر میں جو حکیمانہ نکتہ بیان کیا ہے وہ ہے کہ تخریبی ناصر، خارج سے نہیں آتے بلکہ خود اسی شے میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جس وقت کسی شے کی تعمیر شروع ہوتی ہے ، اس کی تخریب بھی شروع ہوجاتی ہے اور جب فعلِ تخریب مکمل ہوجاتا ہے تو وہ شے فنا ہوجاتی ہے۔"(23)

شعر میں "ہیولیٰ برقِ خرمن کا" ایک اور جانب بھی اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جسمانی طور پر انسان تباہ نہ بھی ہو تو اس کی فکر اور ارد گرد کے حالات بھی بعض اوقات اسے داخلی سطح پر شکست وریخت سے دوچار کرتے رہتے ہیں۔ یہی اس کی تعمیر میں مضمر خرابی ہے۔ سب سے مشکل بوجھ اپنی فکر اور سوچ کا بوجھ ہے۔ اس شعر کا بادی النظر میں ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ شعر ہمیں اپنا وجود قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ جب ہم اپنے وجود کو قبول کر لیں اور نتائج سے باخبر ہوں تو اس سے ڈرنے کی بجائے حقیقتاً جینا شروع کرتے ہیں۔ ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا(24)

ڈاکٹر محمد آصف اس شعر کی ذیل میں غالب کی وجودیت پر بات کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ غالب نے اپنے اشعار میں ان سوالات کا اظہار کیا جو انسانی زندگی کے سب سے بڑے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری ایک ایسے انسان کی فکری سفر کی کہانی ہے جو زندگی کے مصائب اور دکھوں کے بیچ اپنے وجود کا مقصد تلاش کر رہا تھا۔ غالب کی زندگی اور شاعری میں موجودیت کی جھلک اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے ذاتی تجربات نے ان کے فلسفے اور فکر کو کس قدر متاثر کیا۔ ڈاکٹر محمد آصف کے مطابق:

انفرادیت، آزادی، انتخابِ ارادہ، جدت، تخلیقِ نو، تقلید سے گریز، احساسِ انا غالب کے بنیادی اوصاف میں سے ہیں۔ وجودیت کے تصورِ آزادی و انتخاب کے تحت اگر غالب کے ہاں اشعار کی تلاش کی جائے تو بالکل نئے مطلب و معانی سامنے آتے ہیں۔ غالب بھی "سرگشتہ خمارِ رسوم وقیود"

نہیں۔ ان کو بندھے ٹکے قواعد و ضوابط سے نفرت ہے۔ غالب فرسودہ اور گھسی پٹی راہوں پر چلنے کے بجائے نئی دنیا کی تخلیق کرتے ہیں۔(25)

یہ شعر انسان کی مسلسل جدوجہد اور اپنے وجود کی بے ثباتی کو بیان کرتا ہے جہاں انسان کو اپنی زندگی کے معانی خود تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ "بیاباں ماندگی" سے مراد دنیا کی مشکلات، بے رحمی اور انسان کی تنہائی ہے لیکن شاعر کا "ذوق" اس تنہائی کو شکست دینے کی کوشش میں ہے۔ "نقشِ قدم میرا" اسی عارضی وجود کی علامت ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا(26)

اس شعر کے دو مطالب ہو سکتے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ کوئی بھی انسان دوسرے انسان کی داخلی دنیا میں مکمل طور پر جھانک نہیں سکتا جس کی وجہ سے وہ اپنے وجود کے رازوں اور احساسات میں تنہا ہے۔ انسانی جذبات میں عمومیت کے باوجود کوئی دوسرے کے تاثرات سے اس کے دل کی دنیا کے راز نہیں جان پاتا۔ کتنے ہی لوگ سفید پوشی میں زندگی گزارتے ہیں اور کتنے ہی عاشق زبان پر شکوہ و اظہار نہیں لاپاتے۔ یعنی وجودی فلسفے کے مطابق اس ضمن میں غالب فرد کی انفرادیت اور تنہائی کو بیان کر رہے ہیں۔ دوسرا مطلب اپنے اندر جھانکنے اور مقصدِ زندگی کو پانے کا ہے۔ جو اس کی بے مقصدیت کا قلع قمع کر سکتا ہے۔ وجودی فلسفہ کی مد میں دیکھیں تو یہ خود کو جاننے اور اپنے وجود کی حقیقت کو سمجھنے پر زور دیتا ہے۔ اس فلسفے کے مطابق انسان اپنی ذات اور وجود کی گہرائیوں میں اتر کر ہی اپنی اصل شناخت حاصل کر سکتا ہے۔ دوسرا مطلب مذہبی رجحان رکھتا ہے جس میں غالب ان سنے کو سننے کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر شے انسان کو سمجھانے کے لیے ایک ہی حقیقتِ مطلق کی جانب اشارہ کر رہی ہے لیکن وہ اسے اسی وقت سن اور سمجھ سکتا ہے جب اس کی جانب متوجہ ہو۔ اس حوالے سے پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے شرح میں یہ وضاحت کی ہے:

"پردہ پوشی جسے تو حجاب یعنی وہ آڑ یا پردہ سمجھتا ہے جو کسی شخص کو پوشیدہ کرے وہ دراصل حجاب نہیں ہے بلکہ پردہ ساز ہے جس سے نواہائے راز (حقیقت کے نغمے) سرزد ہو رہے ہیں یعنی اشیائے کائنات جن کو تو حجابات سمجھ رہا ہے، دراصل وہ مظاہر ہیں جن سے حقیقت ظاہر ہو رہی ہے اور ہر مظہر زبان حال سے اس کی ہستی پر گواہی دے رہا ہے۔" (27)

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں طُعمہ ہوں ایک ہی نفَسِ جاں گداز کا(28)

یہ شعر انسان کے وجودی تجربات کی شدت اور ان کے اثرات کو برداشت کرنے کی کوشش کی عکاسی کرتا ہے۔ انسان زندگی کے بہت سے معاملات میں مجبورِ محض بن کر رہا جاتا ہے اور اس قدر مصائب برداشت کرتا ہے کہ اس کا اپنا وجود اور ہستی ایک طرح سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اندر ہی اندر گھٹ کر مر جانے کا غم شدید ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے ذریعہ معاش کو تبدیل نہ کر پانا، کسی بہت قریبی کا بچھڑ جانا، زندگی کے شریکِ سفر سے مسلسل اذیت اٹھانا یا کسی ایسی تکلیف میں مبتلا ہونا جس کا کوئی حل نہ نکل سکے۔ اس لیے یہاں "ضبطِ آہ" کا تعلق زندگی کی مشکلات اور مصائب کو خود پر جبر کر کے برداشت کرنے سے ہے۔ انسان ان داخلی تکالیف کو چھپانے کی کوشش میں خود کو داخلی سطح پر کمزور اور ناتواں کر لیتا ہے۔ دوسرا مصرع انسانی زندگی کی ناپائیداری اور موت کی قربت کا احساس اجاگر کرتا ہے، جو اسے زندگی کی لذتوں سے محروم رکھتا ہے۔ وجودی فلسفے میں بھی موت اور انسانی آزادی کی ذمہ داری جیسے موضوعات اہمیت رکھتے ہیں، اور غالب کا یہ شعر ان خیالات کی بہترین ترجمانی کرتا ہے، جہاں انسان زندگی کی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے مسلسل موت کے خوف میں مبتلا رہتا ہے، لیکن اس سے زیادہ دیر تک فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اس کی تشریح میں بیان کیا ہے کہ غالب کے بقول میں آہوں کو اس لیے ضبط کر رہا ہوں کہ یہ یک مشت میری ہستی کو فنا کر دیں۔(29) ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا(30)

انسانیت کی حقیقی صفات ہر آدمی میں نظر نہیں آتیں۔ ہر آدمی کمال انسانیت کے درجے پر نہیں پہنچتا اور اخلاق و فضائل کے اعتبار سے اشرف المخلوقات نہیں بن پاتا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ہر آدمی کو انسان ہونا میسر نہیں، اتنا ہی بدیہی ہے کہ اس کے لیے کوئی دلیل لانے کی ضرورت نہیں۔(31) یہ شعر انسان کے وجود کی جدوجہد اور خود شناسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وجودیت کے فلسفے میں انسان کے لیے اپنی حقیقی انسانیت کو حاصل کرنا اور خود کو پہچاننا ایک مشکل امر ہے۔ یہاں غالب اس حقیقت کو بیان کر رہے ہیں کہ محض آدم کی ہیئت میں پیدا ہو جانا کافی نہیں ہے، انسانیت کا شعور اور اس کی عملی تفہیم ایک الگ اور مشکل کام ہے۔ غالب کا یہ شعر کربِ وجود (Existential Angst) کے موضوع کی عمدہ عکاسی کرتا

ہے۔ پہلا مصرع اشارہ کرتا ہے کہ زندگی کے ہر مرحلے پر انسان مشکلات اور مصائب کا سامنا کرتا ہے۔ یہ تصور وجودیت کے اس بنیادی نکتے سے جڑا ہوا ہے کہ انسانی زندگی پیچیدہ ہے اور اگر انسان اس پیچیدگی کا بوجھ نہ اٹھائے تو زندگی اور بھی بے معنی محسوس ہو جاتی ہے۔ اسی بے معنویت سے جنم لینے والا کرب انسان کی داخلی حالت کو مزید گمبھیر بنا دیتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہر آدمی کے لیے انسانیت کے حقیقی معیار پر پورا اترنا ممکن نہیں۔ وجودی فلسفے میں یہ بات زور پکڑتی ہے کہ انسان کی اصلیت اور اس کی انسانیت کوئی پہلے سے طے شدہ حقیقت نہیں۔ یہاں غالب آدمی اور انسان کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہیں، جو دراصل انسانیت کی اعلیٰ صفات کے حصول کی کوشش اور کشمکش کی علامت ہے۔ اس شعر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ آدمی ہونے کا مطلب محض جسمانی یا سماجی وجود نہیں، بلکہ انسان بننے کے لیے اخلاق، شعور، اور فضائل کا حصول ضروری ہے، اور یہ سفر انتہائی دشوار اور مایوس کن ہو سکتا ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

عشرتِ قتل گہِ اہل تمنا، مت پوچھ　　عیدِ نظّارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا(32)

یہ شعر بظاہر تو ایک عشقیہ شعر ہے جس میں غالب عشاق کا احوال بیان کر رہے ہیں کہ ان کے لیے عشق میں موت بھی عید کے مترادف ہے اور اس میدان میں انسان کے دل کو زخم لگتے ہی رہتے ہیں۔ کربِ وجود کے ضمن میں اس پر غور کیا جائے تو "شمشیر کا عریاں ہونا" یعنی تلوار کا برہنہ ہونا، انسان کی خواہشات کے قتل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فلسفہ وجودیت بتاتا ہے کہ انسان کو ہمیشہ اپنے اندرونی خواب اور آرزوؤں کے قتل کا سامنا رہتا ہے۔ یہ شعر عشق کو ایک ایسی کیفیت کے طور پر پیش کرتا ہے جو انسان کو مسلسل ایک جدوجہد میں مبتلا رکھتی ہے۔ یہ جدوجہد انسان کی اپنی ذات اور وجود کو تلاش کرنے کی ایک علامت ہے۔ عشق کی یہ دردناک لذت انسان کو اپنی حدود و قیود کا احساس دلاتی ہے جو وجودی فلسفے کا ایک مرکزی نقطہ ہے۔ اسی ضمن میں اس شعر کو بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جس میں غالب اس بات کا اعادہ کر رہے ہیں کہ غم و اندوہ سے انسان کو مکمل فرار نہیں ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی زنجیر میں جکڑا ہوا ہی نظر آتا ہے۔ اسی مضمون کو کچھ تبدیلی سے غالب اس طرح باندھتے ہیں:

غَم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے　　غَمِ عِشق گر نہ ہوتا، غَمِ روزگار ہوتا(33)

اسی اندرونی کرب کی ترجمانی غالب ایک اور مشہورِ زمانہ شعر سے یوں ہوتی ہے:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا(34)

یہ شعر اگرچہ غالب کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے کہ غالب کی زندگی میں خواہشات اور آرزوؤں کا ایک انبار تھا، لیکن یہ تمام خواہشات اور ارمان ان کے دکھوں اور غموں میں گم ہو گئے، لیکن اس میں ایک آفاقیت بھی پائی جاتی ہے۔ غالب کی یہ فکری جستجو کہ خواہشات کی کوئی حد نہیں اور زندگی کی حقیقت ان کی تکمیل کے بغیر ختم ہو جاتی ہے، وجودیت کا اہم نکتہ ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے جس میں غالب کی وجودیت، انانیت میں ڈھل جاتی ہے اور وہ خود کو ایک ایسے فرد کے روپ میں دیکھتے ہیں جس کے لیے اس کا وجود دنیا کی ہر شے پر مقدم ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں، کہ ہم الٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا(35)

یہاں کعبہ استعارہ ہے۔ زندگی میں انسان کو استعاراتی حوالے سے کئی دروں پر ناچاہتے ہوئے بھی جھکنا پڑتا ہے اور بہت سے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ غالب ایسے ہر اک حال میں اپنی انفرادیت برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ انفرادیت انانیت کی صورت میں اس شعر میں جھلکتی ہے۔ اپنے وجود پر استفہام اور اس کی کائنات میں موجودگی پر استفسار کے حوالے سے غالب کے دو مزید اشعار کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ ان اشعار میں وجودی مایوسی اور بے بسی کا احساس جھلکتا ہے۔ غالب اپنے گھر کو جہاں اولاد رہی تھی اور نہ ہی بھانجا عارف علی خان جس کی وجہ سے ہر سو ویرانی تھی اور استعاراتاً دہلی کے اجڑنے کو اپنی حالت زار سے منسلک کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پیدائش سے وفات تک رونا ہی انسان کا مقدر ہے۔ پہلے وہ آواز اور آنسوؤں سے روتا ہے، پھر یہ رونا آہوں اور سسکیوں میں بدل جاتا ہے اور یوں ہی اس کی زندگی کا اختتام ہوتا ہے۔ جب کہ دوسرے شعر میں وہ وجودی کرب کی انتہا کو بیان کرتے ہوئے سوچتے ہیں کہ وجود ہی دراصل ہر قسم کی پریشانیوں اور تکالیف کا باعث ہے۔ وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر وہ موجود نہ ہوتے تو اس بے کراں کائنات میں کونسا فرق واقع ہو جانا تھا؟ درحقیقت انسان کا وجود اسے کئی قسم کے آزار سے آشنا کراتا ہے۔ اس لیے اس کے ہونے سے نا ہونا بہتر ہے۔ تیسرے شعر میں پھر سے غالب اسی خیال کو دہرا رہے ہیں کہ تنگی اور پریشانی زندگی کے ساتھ ساتھ ہیں اور کسی بھی ذی روح کے لیے جیتے جی ان سے فرار ناممکن

ہے۔ اس ضمن میں غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ تنگی اور پریشانی متضاد کیفیتیں ہیں۔ اگر یہ کیفیت نہ ہوتی تو اس کی جگہ دوسری لے لیتی، نتیجہ دونوں کا ایک ہے یعنی رنج وملال۔(36)

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا(37)

"تنگیٔ دل کا گلہ کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا"(38)

اجمالاً مرزا اسد اللہ خاں غالب کی پہلی پچاس غزلوں میں وجودِ کرب اور وجودی عناصر کی بات کی جائے تو یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی شاعری میں وجودیت کے عناصر ایک گہرے فلسفیانہ پس منظر کے ساتھ سامنے آتے ہیں، جو زندگی کی بے ثباتی، انسان کے کرب، اور موت کی حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں۔ غالب نے زندگی کو ایک پیچیدہ، گہری اور مایوس کن حقیقت کے طور پر دیکھا، جہاں انسان اپنی تقدیر سے فرار حاصل کرنے کی کوشش میں مسلسل مصائب کا سامنا کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں انسان کی تنہائی، موت کا خوف، اور اپنے وجود کے معنی تلاش کرنے کی جستجو نمایاں ہے۔ لیکن غالب کی وجودیت میں قنوطیت اور ناامیدی کے باوجود ایک ایسی فلسفیانہ بلند پروازی موجود ہے جو انسانی جدوجہد، آزادی، اور خود شناسی کو اہمیت دیتی ہے۔ غالب کا کربِ وجود محض انسان کے دکھوں کی داستان نہیں بلکہ ایک ایسی فکری کوشش ہے جو اسے زندگی کے حقائق کو قبول کرنے اور ان کے ساتھ جینے کی ہمت دیتی ہے۔ یوں غالب کا وجودی فلسفہ ہمیں اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ہم زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں کو تسلیم کریں، مگر ساتھ ہی ساتھ اپنی انفرادیت اور آزادی کا شعور بھی پیدا کریں تاکہ ہم اپنی زندگی میں معنی پیدا کر سکیں۔

حوالہ جات

1. سید احمد دہلوی، مولوی: فرہنگِ آصفیہ؛ دہلی؛ ۱۹۷۴ء؛ جلد چہارم۔ ص:646

2. انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2012ء، ص:193

3 .Baldick, Chris. The Concise Oxford Dictionary of Literary Terms. Oxford University Press, England, 2001-P.89

4. غلام رسول مہر، نوائے سروش، مکمل دیوانِ غالب مع شرح، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، 1968ء، ص:17

5. حسرت موہانی، شارح، "شرح دیوانِ غالب"، لاہور: خزینہ علم و ادب، 2002ء، ص:5

6. محولہ بالا نمبر 4، ص:17

7. ایضاً

8. ایضاً، ص:28

9. ایضاً، ص:29

10. یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شارح: شرح دیوانِ غالب، نئی دہلی: اعتقاد پبلی کیشنز، 1992ء، ص: 250

11. مولانا غلام رسول مہر، نوائے سروش، ص:31

12. ایضاً، ص:31

13. آسی الدنی، شارح: "مکمل شرح دیوانِ غالب" لکھنو: صدیق بک ڈپو، 1931ء، ص:13

14. مولانا غلام رسول مہر، نوائے سروش، ص:34

15. یوسف سلیم چشتی، ص:259

16. مولانا غلام رسول مہر، نوائے سروش، ص:35

17. ایضاً، ص:36

18. مولانا غلام رسول مہر، نوائے سروش، ص:260

19. مولانا غلام رسول مہر، نوائے سروش، ص:40

20. ایضاً، ص:43

21. ایضاً، ص:47

22. القرآن۔ سورہ التین۔ آیت نمبر 5

23. مولانا غلام رسول مہر، نوائے سروش، ص:270

24. ایضاً، ص:51

25. محمد آصف، ڈاکٹر، غالب کی شاعری میں فلسفہ وجودیت کے عناصر، مشمولہ: جنرل آف ریسرچ اردو، ملتان: بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، جلد14، 2008ء، ص:112

26. مولانا غلام رسول مہر، نوائے سروش، ص:53

27. ایضاً، ص:280

28. ایضاً، ص:53

29. یوسف سلیم چشتی، ص:282

30. مولانا غلام رسول مہر، نوائے سروش، ص:69

31. ایضاً، ص:71

32. ایضاً، ص:69

33. ایضاً، ص:82

34. ایضاً، ص:82

35. ایضاً، ص:95

36. ص:164

37. ایضاً، ص:125-124

38. ایضاً، ص:164

References

646; Volume Chaharum. P:1974.Syed Ahmad Dehlvi, Maulavi: Farhang-e-Asfiya; Delhi; 1
193, P:2012.Anwar Jamal, Professor, Adabi Istilahat, Islamabad: National Book Foundation, 2
.Baldick, Chris. The Concise Oxford Dictionary of Literary Terms. Oxford University Press, 3
89. P-2001England,
.Ghulam Rasul Mehr, Nawa-e-Sarosh, Mukammal Diwan-e-Ghalib Ma Sharh, Sheikh 4
17, P:1968Ghulam Ali and Sons, Lahore,
5, P:2002.Hasrat Mohani, Sharah, "Sharh Diwan-e-Ghalib", Lahore: Khazana-e-Ilm o Adab, 5
17, P:4.Mahoola-e-bala number 6
.Idza7
28.Ibid. P:8
29.Ibid. P:9
.Yusuf Salim Chishti, Professor, Sharah: Sharh Diwan-e-Ghalib, Nai Delhi: Eteqad 10
250, P: 1992Publications,
31.Maulana Ghulam Rasul Mehr, Nawa-e-Sarosh, P:11

31.Ibid. P:12
.Asi-ud-din, Sharah: "Mukammal Sharh Diwan-e-Ghalib" Lucknow: Siddiqui Book Depot, 13
13, P:1931
34.Maulana Ghulam Rasul Mehr, Nawa-e-Sarosh, P:14
259.Yusuf Salim Chishti, P:15
35.Maulana Ghulam Rasul Mehr, Nawa-e-Sarosh, P:16
36.Ibid. P:17
260.Maulana Ghulam Rasul Mehr, Nawa-e-Sarosh, P:18
40.Maulana Ghulam Rasul Mehr, Nawa-e-Sarosh, P:19
43.Ibid. P:20
47.Ibid. P:21
5.Al-Quran. Surah Al-Tin. Ayat number 22
270.Maulana Ghulam Rasul Mehr, Nawa-e-Sarosh, P:23
51.Ibid. P:24
.Muhammad Asif, Dr., Ghalib ki Shairi mein Falsafa-e-Wujudyat ke Unsur, Mashmool: 25
112, P:2008 ,14Journal of Research Urdu, Multan: Bahauddin Zakariya University, Volume
53.Maulana Ghulam Rasul Mehr, Nawa-e-Sarosh, P:26
280.Ibid. P:27
53.Ibid. P:28
282.Yusuf Salim Chishti, P:29
69.Maulana Ghulam Rasul Mehr, Nawa-e-Sarosh, P:30
71.Ibid. P:31
69.Ibid. P:32
82.Ibid. P:33
82.Ibid. P:34
95.Ibid. P:35
164.P:36
124-125.Ibid. P:37
164.Ibid. P:38